ABSTRACTS

The Religious Literature of 19th Century.

18th century has remained an important century for the Islamic Nation. The downfall of the greatest Moghal Empire that was at its peak in Aurang Zaib Alamgir time in sub-continent is the greatest tragedy of our history. The decline of Moghal Empire was not a fall of Government, but also of Muslims culture and civilization and even the very existence of Muslims themselves. After the demise of Aurang Zaib Alamgir in 1707A.D his sons were each others throat resulting in is fighting that provided opportunity to Marhatas, Jats, Sikhs and others to occupy territory of the Moghal Empire. It resulted in Chaos in the society and the moral fabric of the once well organized and disciplined Muslim culture and civilization was torn to pieces.

This decline of the Moghals also resulted in economic chaos leaking to the disruption in moral values. Moral turpitude reached its climax. However, in this darkness, group of seriously Concerned and conscientious Muslim citizen came forward to stop this plight. Most prominent among them was Shah Waliullah Dehalvi, who led the fight for renaissance of the Muslims of India, persuading masses to follow Islam in its true spiritual teachings.

He translated the Quran in Persian, wrote a number of books on tafseer and established Madarsas to spread Islamic teachings. Shah Walliullah, his sons Shah Rafiuddin as well Shah Abdul Qadir who also translated Quran in Urdu, contributed through their writings. Shah Walliullah movement letar joined by Syed Ahmed Shaheed and Shah Ismail who authored the famous "Mansab-e-Imamat"

Besides these outstanding leaders, a large number of contributions were also penned by a number of authors listed here.

برکت اللہ خان

اٹھارہویں صدی میں دینی ادب

اٹھارہویں صدی سیاسی، معاشرتی اور معاشی کشمکش کی صدی ہے۔ ارقبے، آبادی اور دولت کے اعتبار سے ایک عظیم سلطنت قائم تھی جس کا شہنشاہ اسّی سالہ اورنگ زیب عالمگیر تھا۔ خود برعظیم کی تاریخ میں اس سے پہلے ایسی سلطنت وجود میں نہیں آئی تھی۔ مغلوں

نے برعظیم کو نہ صرف سیاسی اتحاد سے روشناس کر کے ایک نیا قومی تصور دیا بلکہ ایک وسیع تہذیبی ہم آہنگی پیدا کر کے ایسا سیاسی وتہذیبی ڈھانچہ بھی تیار کیا تھا جس میں معاشرے کی تخلیقی وفکری صلاحیتیں پھل پھول سکیں۔

سترہویں صدی اس تہذیب کا نقطۂ عروج ہے اور اٹھارہویں صدی اس عظیم سلطنت کے زوال کی داستان ہے۔ اورنگ زیب عالمگیر کی وفات (۱۷۰۷ء) اس صدی کا پہلا اور سب سے اہم واقعہ ہے جس کے بعد پچاس سال کے عرصے میں نااہل جانشینوں کی بے طاقتی، خانہ جنگی، عیش پرستی، امراء کی باہمی آویزش، عسکری قوت کی کمزوری اور سلطنت کے وسیع تر مفادات میں اتحاد کے جذبے کے فقدان نے اس وسیع وعریض سلطنت کو پارہ پارہ کر دیا۔ اس کے بعد جو انتظامی حکومتیں قائم ہوئی تھیں وہ انتظامی صلاحیت سے عاری اور امراء کے ہاتھوں کٹھ پتلی تھیں۔ سلطنت کا توازن بگڑتا گیا، دبی ہوئی منفی قوتیں سر اُٹھانے لگیں اور انتشار کے بادل معاشرے پر چھانے لگے۔ یوں تو کسی شخصی حکومت کے بدلنے کا عوام پر بہت کم اثر ہوتا ہے لیکن مغل حکومت کا زوال درحقیقت عوام کا زوال تھا۔ جو مصیبت مغل بادشاہوں پر آئی تھی اس کا اثر امراء ورؤسا سے لے کر عوام الناس تک سب پر برابر پڑا اور مسلم ہندوستان کے تہذیب، تمدن اور ذہن وفکر کے تمام شعبے براہ راست یا بالواسطہ اس سے متاثر ہوئے۔

مغل حکومت کے زوال کا سب سے واضح نتیجہ اقتصادی بدحالی کی شکل میں ظاہر ہوا۔ مرہٹے، جاٹ، سکھ، روہیلے اور آخر میں انگریز سلطنت کے اچھے خاصے علاقے پر قابض ہوگئے۔ بیرونی حملہ آوروں نے قلعے کا خزانہ اور امرا ورؤسا کی حویلیاں بالکل خالی کر دیں۔ بادشاہ اور شہزادے مفلسی کا شکار ہوگئے۔ اس صورت حال میں عوام کی اقتصادی بدحالی کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔ شاہی خزانے میں روپیہ نہ ہونے کی وجہ سے مہینوں اور بعض اوقات برسوں سپاہیوں کو تنخواہیں نہیں ملتی تھیں:

> شہنشاہ اکبر کے زمانے میں محلات شاہی کے ساز وسامان کی فہرست بنا کر دوکانداروں کو دے دی گئی تھی تاکہ اس کو فروخت کر کے سپاہیوں کی تنخواہیں ادا کر دی جائیں۔[۲]

تاریخ عالمگیر ثانی میں لکھا ہے کہ:

> فوجیوں نے تنگ آ کر اپنے گھوڑے بیچ دیئے تھے، پیدل فوج کے پاس وردیاں نہ رہی تھیں، جانوروں کو چارہ نہ ملتا تھا اور وہ بھوک سے مرنے لگے تھے، فوجی اپنے گھروں سے باہر نہ نکلتے تھے بعض اوقات سپاہی سواری کی ہمراہی میں بھی نہ ہوتے تھے۔[۳]

اقتصادی بدحالی اور معاشی پریشانیوں میں اخلاقی قدروں کی پابندی کا ہوش نہیں رہتا۔ چنانچہ شریفانہ اخلاق وخصائل کم ہوتے گئے اور خودغرضی، حرص اور بددیانتی کا چلن عام ہونا شروع ہوا۔ ملک بھر میں عموماً اور دہلی ونواح میں خصوصاً بے چینی اور پریشان حالی کے اثرات نمایاں ہونے لگے۔ لوگ اپنی جان اور عزت بچانے کے لیے دہلی سے بھاگنا شروع ہوگئے۔ خصوصاً اہل ہنر سرپرستوں کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ معاشرے کے اس انتشار کا ردعمل لوگوں پر مختلف صورتوں میں ظاہر ہوا۔ ایک طبقے نے مادی دنیا اور اس کی آلائشوں سے منہ موڑ کر عالم آخرت کی طرف توجہ کی اور مذہب کا سہارا لے کر انفرادی نجات کی فکر میں لگ گیا۔

دوسرے نے دین اور عاقبت کے خیال سے بے نیاز ہوکر حسیاتی و جمالیاتی لذتوں میں پناہ ڈھونڈی (بعضوں نے ان دونوں کشتیوں میں بیک وقت سواری کرنے کی کوشش کی)۔ تیسرے نے حالات کے خلاف احتجاج کیا اور اپنے معاصرین کو ان کی برائیوں کی طرف توجہ دلائی۔ اور چوتھے نے محض احتجاج پر اکتفا نہ کر کے اصلاح احوال کی عملی کوشش کی۔ ان مصلحین کے سرکردہ شاہ ولی اللہ دہلوی تھے جو عالمگیری دور کے ممتاز عالم شاہ عبدالرحیم کے فرزند تھے۔ وہ ۱۷۰۳ء میں پیدا ہوئے اور اپنے والد کی وفات پر سترہ سال کی عمر میں ان کے جانشین بن کر درس و تدریس میں مصروف ہوگئے۔ پھر حج کو گئے اور وہاں سے وطن واپس آ کر ۱۷۳۲ء میں درسیات کے محدود حلقے سے قدم باہر نکالا۔ انھوں نے اپنے شاگردوں کو اسلامی علوم کے مختلف شعبوں میں تربیت دے کر درس و تدریس کے کام پر مامور کر دیا اور خود جہاد بالقلم میں مصروف ہوگئے تاکہ مسلمانانِ ہند کو مذہبی و اخلاقی درماندگی سے نجات دلائیں۔

(۱)

شاہ ولی اللہ نے ایک ایسے مسلم معاشرے کا تصور پیش کیا جس میں لوگ انفعالیت کی شکار دنیا سے بے زار اور سلبی رویے کے قائل تھے اور نہ صرف اپنے انفرادی اور اجتماعی فرائض اور ذمہ داریوں کو بھلا کر عیش و عشرت میں غرق تھے بلکہ اس معاشرے میں لوگ منظّم، مستعد، فرض شناس، قانون پسند اور محنت سے روزی کمانے کے خواہش مند تھے۔ وہ معمولی اور غیر اہم یا کتابی باتوں پر ایک دوسرے سے برسرِ پیکار نہ تھے اور دنیوی اُمور میں افراط و تفریط اور عبادت و ریاضت میں مبالغے سے اجتناب کرتے تھے۔ اس معاشرے میں حکمران طبقہ فہیم اور عدل پسند تھا۔ وہ عوام کے استحصال کو جرم سمجھتا تھا اور انتظامی اُمور کی بجا آوری میں دیانت داری اور فرض شناسی سے کام لیتا تھا۔

مختصراً یہ کہ شاہ ولی اللہ نے ایک متوازن اسلامی معاشرے کا تصور پیش کیا اور اسے روبہ عمل لانے کی کوشش کی۔ اُن کے نزدیک اسلامی معاشرے کے قیام کے لیے ضروری تھا کہ لوگ صحیح قرآنی تعلیمات اور صحیح احادیث نبوی سے واقف ہوں۔ قرآن شریف کو محض دینی فریضے کے لیے پڑھنا اور بات ہے اور اس کی ہدایت سے براہ راست مستفید ہونے کی کوشش کرنا اور بات۔ انھوں نے قرآنی تعلیمات کو عام کرنے کی خاطر کلام اللہ کا فارسی میں ترجمہ کیا اور ترجمے کے ساتھ ایک مقدمہ بھی لکھا جس میں مترجمین کی رہنمائی کے لیے مفید ہدایات دیں۔ آپ نے علم تفسیر پر بھی کتابیں لکھیں اور روایات اسرائیل اور رسوماتِ جاہلیت کے سلسلے میں صحیح رہنمائی کی۔ مسلمانوں کی اخلاقی و روحانی اصلاح کے لیے قرآن شریف کو زیادہ سے زیادہ لوگوں کے لیے قابل فہم بنا دینے کے ساتھ ساتھ شاہ صاحب نے احادیث نبوی کے مستند مجموعے ''مؤطا'' کی فارسی شرح لکھی اور حدیث کی تعلیم کے لیے علاحدہ مدرسہ قائم کیا۔ آپ نے جہاد کی اہمیت، اس کے احکامات اور ضروریات پر ایک مفصل رسالہ لکھا اور عہدِ انحطاط کے اس نظریے کی تردید کی کہ آئندہ اعلیٰ درجے کے دین دار پیدا نہیں ہوں گے۔ فقہ میں شاہ صاحب نے یہ مسلک اختیار کیا کہ چاروں اماموں کو معتبر جانا اور کہا کہ اگر علماء کسی مصلحت کی بنا پر ان آئمہ کرام میں سے کسی ایک کا قول اختیار کریں تو بالکل جائز ہوگا۔ اعتدال کی یہ راہ اختیار کر کے شاہ ولی اللہ نے اہل سنت کے تمام اختلافات اور مذاہب اربعہ کی بے معنی و بے حاصل لڑائیوں کی بیخ کنی کی اور اجتہاد کا دروازہ کھول دیا۔ انھوں نے علوم ظاہری

کے علاوہ علوم باطنی کی بھی تعلیم پائی تھی اور اذکار و اشغال میں بھی مصروف رہے تھے۔ آپ کی تصانیف سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کے قلب پر رموز و اسرار کا غلبہ ہوتا تھا لیکن وہ عام مروجہ تصوف اور متصوفین کے حرکات و افعال سے سخت بیزار تھے۔ عام لوگ جھاڑ پھونک، تعویذ گنڈے، سحر و طلسم کو کرامات سمجھتے تھے اور ان چیزوں پر تصوف اور ولایت کی بنیادیں استوار کرنے والوں کو صوفی سمجھتے تھے۔ شاہ صاحب نے ان چیزوں کو باطل قرار دیا اور ہدایت کی کہ بدعتی پیروں کی بیعت ہرگز نہ کریں۔ اگر ان سے کوئی کرامت بھی دیکھو تو اس کا طلسمات سحر سمجھو، جس کا قرب الٰہی سے کوئی تعلق نہیں۔ آپ نے اپنی تصنیفات میں اس بات کی توضیع بھی کی کہ تصوف کا کتنا حصہ اسلام ہے اور کون کون سے غیر اسلامی عناصر اس میں شامل ہو گئے ہیں:

> آپ نے وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے تصور کو تاویل و تعبیر میں پیش کر کے مولویوں کی اس بھڑک کو مٹا دیا جو ان بے چاروں میں صوفی و صوفیت کے متعلق پائی جاتی تھی۔[۴]

شاہ ولی اللہ نے جس طرح تصوف کی تعلیمات، تعلیقات اور مروجہ معمولات میں اسلامی اور غیر اسلامی عناصر کی تفریق کر کے بات صاف کی اسی طرح تاریخ اسلام اور تاریخ مسلمین کے اصولی اور باریک تفریق کو بھی واضح کیا اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ گذشتہ کئی صدیوں میں اسلام قبول کرنے والی اقوام کے درمیان فی الواقع اسلام کا کیا حال رہا ہے اور وہ کون کون سی جاہلانہ آمیزش ہیں جو مسلمانوں کے عقائد، افکار، علوم اخلاق، تمدن اور سیاست میں ہوتی رہی ہیں۔ تمام خرابیوں کی بنیاد انھوں نے دو باتوں کو قرار دیا، ایک تو اقتدارِ سیاسی کا خلافت سے بادشاہی کی طرف انتقال۔ دوسرا روحِ اجتہاد کا مردہ ہو کر تقلید جامد کا دماغوں پر تسلط۔

شاہ ولی اللہ نے ایک اور بڑا کام یہ کیا کہ اسلام کے پورے فکری، اخلاقی، شرعی اور تمدنی نظام کو ایک مرتب، منظّم و مربوط صورت میں پیش کیا۔ پہلے انھوں نے مابعد الطبعی مسائل کو سلجھا کر فلسفۂ اسلام مدون کیا۔ پھر اس پر ایک نظامِ اخلاق مرتب کیا اور دونوں راہوں میں یونانی، رومی، ہندوستانی اور ایرانی اثرات سے پہلو بچا کر خالص اسلامی تعلیمات کو پیش نظر رکھا۔ نیز نظامِ اخلاق پر انھوں نے ایک اجتماعی فلسفے کی عمارت اُٹھائی اور اس سلسلے میں تدبیرِ منزل، آداب معاشرت، سیاست، تمدن، عدالت، ضرب محاصل، انتظامی ملکی اور عسکری تنظیم وغیرہ کی تفصیلات بیان کیں اور ساتھ ہی ان اسباب پر روشنی ڈالی جس سے تمدن میں فساد پیدا ہوتا ہے۔ پھر وہ نظامِ شریعت، عباداتِ احکام اور قوانین کو پیش کر کے انھیں ہر ایک چیز کی حکمتیں سمجھاتے چلے جاتے ہیں۔

آخر میں تاریخ و ملل و شرائع پر نظر ڈال کر اسلام و جاہلیت کی تاریخی کشمکش کا تصور پیش کرتے ہیں۔ انھوں نے جاہلی حکومت اور اسلامی حکومت کے فرق کو بالکل واضح کر کے لوگوں کے سامنے رکھ دیا اور اس بحث کو ایسے طریقوں سے پیش کیا جن کی وجہ سے اصحابِ ایمان کے لیے جاہلی حکومت کو اسلامی حکومت سے بدلنے کی جدوجہد کیے بغیر چین سے بیٹھنا محال ہو گیا۔

شاہ ولی اللہ نے محض مسلمانوں کی فکری، دینی اور اخلاقی اصلاح و رہنمائی ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ قوم کی معاشرتی خرابیوں کی طرف بھی توجہ دلائی اور خصوصیت سے ان برائیوں کو دور کرنے کی تلقین کی جو ہندوؤں کے زیرِ اثر ہندوستان کے مسلمانوں کی زندگیوں

میں داخل ہوگئی تھیں۔ مثلاً بیواؤں کی دوسری شادی نہ کرنا، طلاق کو ناجائز سمجھنا، بڑے بڑے مہر باندھنا، خوشی اور غم کی تقریبوں پر محض دکھاوے کی خاطر اسراف سے کام لینا۔ شاہ صاحب کو اس کا پورا پورا احساس تھا کہ اجتماعی، اخلاق اس وقت تک درست نہیں ہوسکتا جب تک معاشرے میں ایسا اجتماعی نظام قائم نہ ہوجائے جو افراط تفریط ناہموار اور عدم توازن سے پاک ہو اور جس کی اساس اصول عدل پر رکھی گئی ہو۔ شاہ صاحب کا خیال تھا کہ اجتماعی اخلاق میں حسن وکمال ایسی صورت میں پیدا ہوسکتا ہے کہ حکومت کے معاشی نظام میں ایسا اعتدال ہو کہ اس میں نہ بے باکانہ عیش پسندی کی گنجائش ہو نہ افلاس وفقر وفاقے کی۔ اس نظام میں ایک طرف تو معاشی دستبرد اور آئینی استحصال کو کوئی دخل ہو اور نہ وہ معیشت کے ترقی پذیر وسائل سے خالی اور محروم ہو۔ مختصر یہ کہ اٹھارہویں صدی عیسوی کے مسلمانوں کی روحانی، مذہبی، اخلاقی، فکری، سیاسی، اقتصادی، معاشرتی اور تعلیمی حالت کا شاہ صاحب نے گہرا مطالعہ کیا اور اس کے محرکات ومیلانات کا اصل سبب اور اس کا حل بھی پیش کیا۔

شاہ ولی اللہ نے ایسی اصلاحی تحریکیں شروع کیں جو مسلمانوں کی اصلاح وبہتری کے لیے ضروری تھیں۔ اس ضمن میں ان کے صاحبزادوں نے بھی ان کی تعلیمات کو عوام الناس تک پہنچانے کے لیے بھرپور جدوجہد کی۔ یہ درست ہے کہ علمائے حق کے اپنے خاص طریقے ہوتے ہیں اور ان طریقوں کو بعض دفعہ عام رواج کے مطابق واضح نہیں کیا جاسکتا اور وہ بھی ڈیڑھ صدی بعد۔ لیکن ایسی تحریکوں کی وضاحت کی راہ میں مشکلات اور رکاوٹیں بھی ہوتی ہیں کیوں کہ ان تحریکوں پر عقیدت اور تقدس کی اتنی گہری تہیں چڑھی ہوئی ہوتی ہیں کہ انھیں ہٹا کر تحریکوں کے پیچھے کام کرنے والے محرکات کا سمجھنا اور سمجھانا مشکل ہوجاتا ہے۔ تحریکوں میں فکر اور اس کی بنیاد پر اقتدار حاصل کرنے کے لیے جو طریق کار اور داؤ پیچ اختیار کیے جاتے ہیں وہ دونوں ہی اپنی اپنی جگہ اہم ہوتے ہیں اور کسی ایک کو دوسرے پر فوقیت نہیں دی جاسکتی۔ لیکن جب طریق کار ناکام ہوجاتا ہے تو یہ بنیادی حد تک فکر ہی کی ناکامی تصور ہوتی ہے، کیوں کہ اصولی طور پر تو فکر خود ہی ان طبقوں اور گروہوں کی نشاندہی کرتی ہے جو اس فکر کو بروئے کار لاسکتے ہیں۔ مگر اُن کے فلسفے کی تمام عظمت کے باوجود اس میں اس سمت کوئی اشارہ نہیں کیا گیا۔ چنانچہ پون صدی کے بعد جب ایک مخصوص طریق کار میں ناکامی ہوئی تو فوری طور پر ایک نیا طریق کار سوچا گیا اور یہی وہ طریق کار تھا جو اس برصغیر میں پھر پون صدی تک مسلمانوں کے ایک بہت بڑے گروہ کو متاثر اور متحرک کرتا رہا اور پھر وہ وقت بھی آیا، وعظ ونصیحت کے شیدائیوں اور منبر پر بیٹھ کر رُشد وہدایت کی راہ دکھانے والوں کو خود ہی شمشیر بکف میدان میں نکلنے پر مجبور کیا۔ چنانچہ اب یہ طریق کار مروج ہوا کہ پھر اس کو متحرک کیا جائے اور ان کو شمشیر بدست دشمنوں سے لڑایا جائے۔ یہی وہ تحریک تھی جو شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالعزیز کے فکری پرچم تلے منظم ہوئی۔

اولاد شاہ ولی اللہ شاہ عبدالقادر نے قرآن مجید کا اردو میں ترجمہ کیا۔ شاہ رفیع الدین، شاہ عبدالقادر سے عمر میں پانچ سال بڑے تھے اس لیے گمان یہی ہے کہ قرآن کا ترجمہ پہلے شاہ رفیع الدین نے کیا ہوگا۔

شاہ عبدالقادر کا دور: ۱۱۶۷ھ تا ۱۲۳۰ھ بمطابق ۱۷۵۳ء تا ۱۸۱۴ء۔ مولانا عبدالقادر، شاہ ولی اللہ کے صاحبزادے تھے اور تفسیر حدیث

اورفقہ کے عالم تھے۔

آپ کے علم وفضل کا بیان کرنا ایسا ہے کہ کوئی آفتاب کی تعریف فروغ اور فلک کی مدح بلندی کے ساتھ کرے، حقیقت میں یہی وہ لوگ تھے جنھوں نے عیسائی مشنریوں کی سرگرمیوں سے مقابلہ کرنے کے لیے ایسا ادب تخلیق کیا جو مشنریوں کی سرگرمیوں کا شافی جواب ہو۔ مسلمانوں میں بدحالی کے احساس کو پیدا کرنے کے ساتھ انھیں ترقی کا خیال دل میں پیدا کیا اور ان کی کھوئی ہوئی عظمت کو دوبارہ بحال کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

(۲)

ہندوؤں نے مسلمانوں کی حکمرانی کے ادوار میں ان کی زبانیں سیکھیں، ان کے تمدنی اثرات قبول کیے، بالکل اسی طرح جب مغربی تہذیب کی یلغار ہوئی تو انھوں نے اس یلغار کے ریلے کو روکنے کے بجائے اس کے ساتھ چلنے کا فیصلہ کیا۔ اس تہذیب کے اثرات کو بہت حد تک قبول کرنے کا فیصلہ کیا، کیوں کہ تجارتی اقوام اور طبقوں میں تہذیبی اثرات کو قبول کرنے کا ایک بنیادی مقصد ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ بنگال کے ہندو زمین دار اور تاجر طبقے نے صرف دولت ہی نہیں کمائی بلکہ وہ ہندو معاشرے میں مغربی افکار اور تہذیب کے نقیب بھی بنے۔ انھوں نے انھی افکار سے متاثر ہو کر اپنے معاشرے کی اصلاح کا بیڑا اُٹھایا۔

ہندو معاشرے میں جس وقت مغربی افکار اور تعلیم کا چرچا ہو رہا تھا اس وقت مسلم معاشرے میں مغرب سے آنے والے افکار و تہذیب کے خلاف نفرت کے سوتے پھوٹ رہے تھے، کیوں کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی راہ میں آنے والے برطانوی تاجروں نے ان مسلمانوں کی دنیا تباہ کر دی تھی۔ ان کی زمین داریاں لُٹ گئیں اور امارات قصۂ پارینہ بن گئی تھیں۔ جس حکومت کے بل بوتے پر آسودگی کے دن گزارے تھے اس حکومت کی بساط ہی الٹ گئی تھی اس سے ظاہر ہے کہ مسلمانوں کا ردعمل اس نئی طاقت، نئی تہذیب اور نئے افکار کے بارے میں کبھی ہمدردانہ نہیں ہو سکتا تھا اور یہی وہ دو بنیادی ردعمل تھے جو اس صدی میں ظہور پذیر ہوئے۔ ایک ردعمل نے حاجی شریعت اللہ اور دودھو میاں اور تیتو میر کی تحریک کو جنم دیا اور دوسرے ردعمل نے برہمو سماج کو جنم دیا۔ یوں انگریزی زبان اور انگریزی تہذیب کے مقابلے کے لیے فضا ہموار ہوئی اور انگریزی زبان اور انگریزی افکار کو قبول کرنے کے لیے راستہ ہموار کیا گیا۔

اٹھارویں صدی کے آخری نصف کے اختتام تک ایسٹ انڈیا کمپنی کا اپنے مقبوضہ علاقوں میں تعلیم کے رواج دینے کا کوئی واضح منصوبہ موجود نہیں تھا۔ یہ ایسٹ انڈیا کمپنی کا وہ دور تھا جب اس کا دائرہ تجارت تک محدود تھا اور اس کی ضرورت تجارت تک محدود تھی۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے چارلس گرانٹ کا مغربی تعلیم کے رواج کے بارے میں ایک رسالہ اس نے ۱۷۹۲ء میں لکھنا شروع کیا اور ۱۷۹۷ء میں یہ مکمل ہو کر شائع ہوا۔ اس رسالہ میں پہلی بار ایسٹ انڈیا کمپنی کے کسی ملازم نے اس مسئلے پر قلم اٹھایا۔ چنانچہ گرانٹ ہندوستانیوں کو مغربی علوم سے روشناس کرانے کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے لکھتا ہے:

> اس تعلیم سے ہندوؤں کو جو سب سے اہم فائدہ حاصل ہوگا وہ ہمارے مذہب کا علم ہے جس کے اصول سیدھے سادے ہیں اور چھوٹے چھوٹے رسالوں اور کتابوں میں محفوظ ہیں۔ ان رسالوں اور کتابوں کو پڑھانے کے بعد

ان ہندوؤں کو توحید کی تعلیم دی جائے گی اور انسان کی حقیقی تاریخ اور عظمت سے آگاہ کیا جائے گا اور ان کے تمام عقائد کو باطل ٹھہرانے کے تمام ذرائع اختیار کیے جائیں گے جو حقیقت میں باطل اور جھوٹے ہیں اس کے بعد انھیں پاکیزہ اخلاق اور پاک فرائض کی تعلیم دی جائے گی۔ جزا اور سزا، آخرت اور آخرت کی باتیں بتائی جائیں گی۔ جہاں ایسے پاکیزہ عقائد کی تعلیم ہوگی وہاں بت پرستی، اوہام پرستی، لکڑی اور پتھروں کی پوجا ہمیشہ کے لیے ختم ہوجائے گی۔[۶]

اس رسالے میں مسلمانوں کا خصوصی طور پر ذکر کیا، کیوں کہ مسلمانوں کو عیسائیوں کی توحید پرستی زیادہ متاثر نہیں کرسکتی تھی، اس لیے شروع میں ان کو نظر انداز کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ چنانچہ مسٹر گرانٹ ہی کے ایماء پر ۱۷۹۳ء میں مسٹر فورس نے برطانوی پارلیمنٹ میں ہندوستان میں انگریزی تعلیم کے رواج کے متعلق ایک قرارداد پیش کی اس قرارداد میں کہا گیا تھا کہ حکومت کا فرض ہے کہ برٹش انڈیا کے باشندوں کی بہبود اور ترقی کے لیے ہر جائز اور ممکن وسیلہ عمل میں لایا جائے اور اس سلسلے میں ایسی کاروائی کرے جس سے تدریجاً ہندوستان کے باشندوں کو مفید علم حاصل کرنے کا موقع ہاتھ آئے اور ان کی مذہبی اور اخلاقی ترقی کے لیے معاون ثابت ہو۔ نیز ہندوستان میں پروٹسٹنٹ مذہب کے عقیدے کے مطابق عبادت اور تعلیم کے لیے آسانیاں بہم پہنچائی جائیں۔ اس مقصد کے لیے وقتاً فوقتاً معلم بھیجے جائیں۔ پارلیمنٹ نے اس قرارداد کو منظور کرنے سے انکار کردیا اس قرارداد کی مخالفت میں سب سے پیش پیش خود کمپنی کے ارباب حل وعقد تھے۔ چنانچہ کمپنی کے ایک ڈائرکٹر نے جو پارلیمنٹ کا رکن تھا اس قرارداد کی مخالفت کی اور کہا یہ منصوبہ بڑا ہی خطرناک ہے اور سیاسی طور پر بھی یہ مہلک ہے کیوں کہ اس اقدام سے ملک کا امن خطرے میں پڑ جانے کا امکان ہے، اس سے کمپنی کا پورا کاروبار تہس نہس ہوجائے گا اور بغاوت پھیل جائے گی۔ جس دن ہم نے ہندوستان میں تبدیلیٔ مذہب کے لیے کوئی قدم اُٹھایا وہ حکومت برطانیہ کے زوال کا پہلا دن ثابت ہوگا اور ہندوستان میں ان کی برتری ختم ہوجائے گی۔ یہ منصوبہ سیاسی طور پر بھی مہلک ہوگا کیوں کہ ایک مذہب کے قائم ہوجانے سے انسانوں کے مقاصد متحد ہوجائیں گے۔ اگر ہندوستان میں یکسانیت پیدا ہوگئی تو انگریزی حکومت کا خاتمہ ہوجائے گا۔ دوسرے مذاہب کے پیروکاروں کو اپنے مذہب میں لانے کا اصول اس اٹھارہویں صدی میں خلاف مصلحت سے اگر تھوڑی دیر کے لیے مان بھی لیا جائے کہ چند لاکھ عیسائی ہوگئے تو اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا بلکہ فائدہ کے بجائے سخت مصیبت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ امریکہ میں درس گاہیں اور کالج قائم کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک ہمارے ہاتھوں سے نکل گیا، اس طرح جب نوجوان پادری اندرون ہندوستان پھیلنے لگیں گے تو کمپنی کے تمام منافع کا خاتمہ ہوجائے گا اگر کسی ہندوستانی کو واقعی تعلیم حاصل کرنا ہو تو وہ انگلستان آکر تعلیم حاصل کرے۔

ولبرفورس کی یہ تجویز نامنظور ہوگئی اور اس طرح چارلس گرانٹ کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا۔ لیکن اس نے ہمت نہ ہاری اس نے محسوس کیا کہ ان منصوبوں کی تکمیل کے لیے پارلیمنٹ اور خود ایسٹ انڈیا کمپنی کے حلقوں میں ذاتی اثر ورسوخ ضروری ہے چنانچہ اس نے اس طرف توجہ کی اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۷۹۴ء میں وہ کمپنی کا ڈائریکٹر منتخب ہوگیا اور ۱۸۰۲ء میں وہ پارلیمنٹ کا رکن بھی چن لیا گیا۔ اس

نے اپنے اثر ورسوخ کو پوری طرح استعمال اور ہندوستان میں تعلیم عام کرنے اور عیسائیت کے پرچار کے سلسلے میں کئی پمفلٹ اور رسالے بھی قلم بند کیے۔

وہ ایک رسالے میں لکھتا ہے:

> پادریوں اور معلموں کو ہندوستان بھیجنے کی اشد ضرورت ہے تاکہ وہاں کے غیر مہذب اور اخلاقی قدروں سے ناواقف لوگوں کو صحیح راستہ دکھا سکیں۔[۷]

اس پمفلٹ میں بڑی دردمندی سے اپیل کی گئی تھی کہ:

> ہمارے مقبوضات میں ایسے لوگ بستے ہیں جن کو سچے مذہب کا راستہ دکھانا ہم پر فرض ہے۔ اس سے ہمیں مذہبی فائدے سے بڑھ کر سیاسی فائدہ حاصل ہوگا کیوں کہ اگر ہم نے اپنی زبان، اپنا علم، اپنے خیالات اور مذہب ایشیائی ممالک میں داخل کر دیا تو ہماری حقیقی فتح ہوگی۔[۸]

اسلامی حکومت کے زوال کے بعد مسلمان عیسائیت کے خوف میں مبتلا ہو گئے تھے اُن کی حالت کچھ اس طرح گر گئی کہ ان کے پاس ایسے ذرائع بھی باقی نہیں رہے کہ جن سے وہ اپنے بچوں کو ایسی تعلیم دے سکیں جن سے آئندہ حکومت میں کسی عہدے پر فائز ہونے کے لائق بن سکیں۔ انھی حالات اور خیالات کے پیش نظر گورنر جنرل لارڈ ہیسٹینگز نے مدرسے کے قیام کی منظوری دے دی، لیکن آہستہ آہستہ پارلیمنٹ کی ایک مخصوص کمیٹی نے مذہبی پروپیگنڈے کے لیے بڑی ہوشیاری سے کام لیا۔ مدرسہ عامہ کے قیام سے ایک بات واضح ہو جاتی ہے کہ اٹھارہویں صدی کے آخری نصف اختتام تک ایسٹ انڈیا کمپنی کا اپنے مقبوضہ علاقوں میں تعلیم کے رواج دینے کا کوئی واضح منصوبہ موجود نہیں تھا یہی وجہ ہے کہ اس دور میں مغربی تعلیم کے رواج کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔ لیکن چارلس گرانٹ اور مسٹر ولبرفورس اس کوشش میں رہے کہ کسی طرح مغربی علوم کو رائج کیا جائے اور عیسائیت کا پرچار کیا جائے۔ چارلس گرانٹ نے کمپنی کا ڈائریکٹر اور پارلیمنٹ کا رکن منتخب ہونے کا پوری طرح اپنا اثر رسوخ استعمال کیا اور ہندوستان میں تعلیم عام کرنے اور عیسائیت کے پرچار کے سلسلے میں کئی ایک پمفلٹ اور رسالے بھی قلم بند کیے۔

ایک بات مسلمہ ہے کہ مسلمانوں میں کوئی ایسا طبقہ وجود میں نہیں آیا تھا جو بحیثیت طبقے کے کمپنی اور دوسرے برطانوی تجارتی اور صنعتی طبقوں سے ہم آہنگ ہو سکتا اور اس کے مفادات کو اپنا سکتا۔ مسلمانوں کے مختلف طبقے ایسی صف میں کھڑے تھے جو کمپنی کے مفادات سے ٹکراتی تھی چنانچہ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں میں برطانوی تہذیب، زبان اور افکارِ علوم کے خلاف شدید رجحانات پائے جاتے تھے اور برطانوی حکام بھی ان رجحانات سے پوری طرح آشنا تھا۔ چنانچہ مختلف حکام کی طرف سے پارلیمنٹ کی مختلف کمیٹیوں کے روبرو جو شہادتیں دی گئی تھیں ان کی جانچ پڑتال کی جائے تو یہ حقیقت معلوم ہو جائے گی۔ ان حکام کے دلوں میں مسلمانوں کی طرف سے کدورتوں کی تہیں جمی ہوئی تھیں۔ مذہبی پروپیگنڈے کے لیے کس ہوشیاری سے کام ہو رہا تھا اس بیان سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ ہم لوگوں کا اصل اصول یہ ہونا چاہیے کہ لوگوں کو اس سے بہتر علم کی تعلیم دی جائے جس تعلیم پر وہ رضامند ہوں۔ اس میں

کوئی شبہ نہیں کہ کوئی تعلیم جو مذہب عیسوی کے اصولوں پر مبنی نہ ہو وہ ناقص ہے۔اسی طرح ایک موقعے پر یہ بیان بھی دیا گیا کہ:

> لوگ عیسائی بنانے کے طریقے میں غلطی کرتے ہیں میرا تو ایمان ہے کہ جس طرح ہمارے آباؤاجداد سب کے سب ایک ساتھ عیسائی ہوگئے تھے اسی طرح یہاں بھی سب کے سب عیسائی ہوجائیں گے ملک میں عیسائی تعلیم بلاواسطہ پادریوں کے ذریعے اور بالواسطہ کتابوں، اخباروں اور یورپین لوگوں سے بات چیت اور میل ملاپ کے ذریعے سے نفوذ کرے گی۔ یہاں تک کہ عیسوی تعلیم سے ہر سوسائٹی متاثر ہوجائے گی تب جا کر ہزاروں کی تعداد میں لوگ عیسوی مذہب قبول کریں گے۔[9]

ان مقاصد نے مسلمانوں کو مغربی تعلیم سے متنفر کر دیا اور یہ نفرت اس لیے بھی بہت دنوں تک قائم رہی کہ مسلمانوں میں وہ درمیانی طبقہ جنم ہی نہ لے سکا جو برطانوی تاجروں کے گماشتے یا ایجنٹ کے طور پر کام کرتا اور دنیاوی جاہ وجلال کے لیے اسے انگریزی میں کشش ہوتی۔

اس طرح سے **ایسٹ انڈیا کمپنی** کے دور حکومت نے بنگال کے دور حکومت میں بنگال کی سرزمین میں دو متضاد رجحانات کو جنم دیا۔مسلمانوں کو ماضی پرستی کی طرف دھکیل دیا، ان کو ہر نئی چیز سے نفرت ہوگئی۔مغربی افکار، انگریزی تعلیم، انگریزی زبان، انگریزی نوکری، غرض یہ کہ تمام چیزیں ان کے لیے نئی ثابت ہوئیں اور وہ ماضی کے دھندلکوں میں گم ہوتے چلے گئے اور یہ نفرت روز بروز بڑھتی چلی گئی، ان کی تحریکیں بھی ماضی کے احیاء پر مبنی تھیں۔ وہ ماضی میں سکون کی تلاش کرتے تھے۔ان کو ہندوؤں سے بھی نفرت ہوگئی جو نو آمدہ طاقتوں اور ان کے افکار سے ناتا جوڑ رہے تھے۔اس طرح ان کو ہندوؤں میں بھی اپنا دشمن نظر آنے لگا۔ پھر یہی ہوا، برصغیر کی دو بڑی قومیں ایک دوسرے سے الگ ہوگئیں اور ان کی وہ صلاحیتیں جو مل کر دنیا کے سامنے آئیں ایک دوسرے سے جنگ کرنے، نفرت کرنے اور ہندو مسلم فسادات کی شکل میں ظاہر ہونے لگیں اور مذہب جو آپس میں بیر رکھنا نہیں سکھاتا، آج تک یہی سکھا رہا ہے۔

عیسائی مبلغین نے اپنے مذہب کی تبلیغ کے لیے بھرپور پرچار کیا اور نہ صرف بائبل کو اردو میں ترجمہ کرنے کی کوشش کی بلکہ زبان کے قواعد بھی مرتب کیے۔اردو زبان میں مغربی اقوام نے غیر معمولی دلچسپی تبلیغِ عیسائیت کے لیے لی۔گو کہ اس ضمن میں ان کے تجارتی اور سیاسی مقاصد بھی تھے۔مغربی اقوام کے قدم آہستہ آہستہ یہاں جمتے گئے۔عیسائی اور ہندو اپنے مذہب کی ترویج اور اس کے پرچار میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگے۔شلزے جو ایک مبلغ تھا اس نے انجیل مقدس کا ترجمہ کیا۔

اٹھارہویں صدی میں بائبل کے ترجمے اردو میں ہوئے، ہندوؤں کی مقدس کتابوں کے ترجموں کا آغاز بھی اسی صدی میں ہوا۔اٹھارہویں صدی کے حوصلہ شکن حالات نے مذہب کے احیاء کے لیے راستہ ہموار کیا، کیوں کہ یہ ایسا دور تھا جب عیسائی مبلغ اپنے مذہب کا پرچار کر رہے تھے تو دوسری طرف ہندو اور دیگر غیر مسلم قوتیں بھی اپنے مذہب کی تبلیغ کر رہی تھیں۔اس دور میں علم دین کو عوام تک پہنچا کر ان میں اصلاح اور زندگی کا نیا حوصلہ پیدا کرنے کی کوششوں کا شعور ملتا ہے۔یہ کام اس دور میں مسلمان علماء نے کیا۔اس کے علاوہ عیسائی مبلغوں نے بھی، جو برعظیم کے انتشار سے فائدہ اٹھا کر عیسائی مذہب کی تبلیغ میں مصروف تھے۔جس طرح قرآن مجید کا

پہلاترجمہ اس صدی میں ہوا، اسی طرح بائبل اور بھگوت گیتا کے تراجم کی پہلی کوشش بھی اسی صدی میں ہوئی۔

اس صدی میں سات سمندر پار سے آئی ہوئی قوموں نے اپنے قدم اس سرزمین پر جمائے اور عیسائی مشینریوں اور عیسائی مبلغوں نے اپنے مذہب کی تبلیغ کے لیے کوششیں شروع کیں۔ جس سے مسلمانوں کے دل میں بھی اپنے مذہب کی بقا اور اس کے پرچار کا شوق اُبھرا اور عیسائیت اور دیگر مذاہب کی نفرت ان کے دل میں بیٹھ گئی۔ پھر اس وقت کے علماء نے بھی ان مشنریوں سے مقابلہ کیا، مناظرے کیے اور جو خوف مسلمانوں کے دل میں پیدا ہو گیا تھا اس کے لیے ایسا دینی ادب تخلیق کیا جس سے ان غیر مذہب قوموں کو جواب دیا جا سکے۔

(۳)

مذکورہ صورت حال میں **شاہ ولی اللہ، سید احمد شہید اور ان کی تحریک** کا ایک ہی مقصد رہا ہے کہ دعوت و تبلیغ سے عوام کو متحرک اور منظّم کیا جائے۔ سید احمد کی تحریک میں شاہ اسمٰعیل کا درجہ بہت بلند ہے اور بعض صورتوں میں تو ایسا ہوتا ہے جیسے اس تحریک کے خدوخال متعین کرنے میں ان کو اولیت حاصل ہے اور اس مقصد کے لیے ان کی تصنیف کا درجہ بلند ہے کیوں کہ ان سے اس تحریک کے طریق کار کے بارے میں خاصا اہم مواد ملتا ہے۔ اپنی معرکۃ الآرا تصنیف ''منصب امامت'' میں لکھتے ہیں" حق جل وعلیٰ اپنی حکمت کاملہ سے ان مقبولان بارگاہ کے مختلف مزاج لوگوں کی تربیت کا سلیقہ اور فصیح کلام اور بیان بلیغ کی قوت، مقدمہ، ہدایت، تقریر، اظہار، مافی الضمیر کے باب میں عطا فرما دیتا ہے۔ چنانچہ اللہ رب العزت نے حضرت داؤدؑ کے حق میں فرمایا کہ ہم نے اس کو حکمت اور فعل خطابت عطا فرمائے، حکمت سے مراد یہی تربیت کا سلیقہ اور فعل خطابت کے معنی بیان بلیغ ہے اور حضرت محمد ﷺ کو ارشاد فرمایا کہ ان کے نفسوں سے بلاغت سے بات کرو۔ لیکن غور کرنا چاہیے کہ ہادیان مبعوث کی دعوت اور طرح کی ہوتی ہے اور دانش مندان فنون کی تعلیم دوسری طرح کی ان کے درمیان تمیز کرنا دو طرح پر ہے۔

دعوت کا پہلا طریقہ: یہ کہ ان کی دعوت کلام محاورات اور اہل عرف پر جاری ہوتا ہے جو کہ اپنے معاملات اور مکالمات میں اس کو استعمال کرتے ہیں اور دانایان علم کلام اور مصنفین کتب کی اصطلاحات پر جاری نہیں ہوتا کہ اپنی تحریر و تقریر کو اس کی بنا پر کریں۔

دعوت کے دو طریقے: دعوت و تبلیغ میں حکمت اور بصیرت سے کام لیا جاتا ہے۔ جاننا چاہیے کہ دعوت کے دو طریقے ہوتے ہیں اور یہ دعوت الٰہی دو طریقوں سے ظاہر ہوتی ہے۔

بیان حکمت: اللہ رب العزت اپنی خاص رحمت سے ان کو قوت بیان اس طرح عنایت فرما دیتے ہیں کہ اپنے مافی الضمیر کے مقصد کو دلائل و براہین، تمثیلات و تشبیہات سے اس طرح روشن کرتے ہیں کہ ان کا مدعا سامعین کی نظر میں یہاں تک ظاہر ہو جاتا ہے کہ معقول معانی محسوس صورت میں ظاہر ہو جاتے ہیں اور اسی کی صورت ہو بہو سامعین کے صفحۂ خیال پر منقش ہو جاتی ہے۔ حتیٰ کہ ہر سامع پر صدق دل سے ان کی گواہی ظاہر ہوتی ہے۔ اور ہر سلیم الوجود کے دل کو ان کے صدق سے اطمینان حاصل ہوتا ہے ہر صاحب عقل کی عقل انھیں پسند کرتی ہے اور صاحب خیال کا خیال ان کی طرف پرواز کرتا ہے اگرچہ بہت سے سامعین اپنی ہٹ دھرمی سے انھیں منظور

نہیں کرتے اور تعصب کے سبب سے اپنی زبان سے ان کا اقرار نہیں کرتے لیکن دل میں وہ بھی جانتے ہیں کہ حق ان ہی کی طرف ہے اور تکبر خود اپنے آپ میں ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

انھوں نے اس کا انکار کیا جو ہم نے ان کو کہا مگر ان کے دلوں کو یقین تھا کہ ظلم اور تکبر سے انکار کیا۔[۱۰]

کلام موعظت: کلام موعظت کا بیان یہ ہے کہ اکثر اوقات غافلوں کی بیداری، جاہلوں کی آگاہی اور پست طبقوں کی بلند ہمتی کے لیے شوق آمیز اور وجد انگیز کلام، محبت الٰہی کا بیان، وسعت، رحمت اور شدت غضب کا ذکر یا ان معاملات راز و نیاز کا بیان جو اللہ عزوجل اور اس کے بندوں کے درمیان ہو، سلف وخلف زمانے کی گردش، سکھ اور دکھ کے معاملات ان کی تفصیلات اور برزخ و قیامت اور دوزخ و بہشت کے احوال یا ان کے مانند ایسے حالات سناتے ہیں جس سے سامعین کے دل میں اُمنگ اور خواہش پیدا ہو۔

اگر چہ ایسے کلمات ہر زمانے میں واعظوں کا مقصد اسی حد تک ہوتا ہے کہ رقت، جگر گداز نعرے، وجد و اضطراب اور پیچ و تاب کی حالت حاضرین مجلس سے ظاہر ہو اور انبیاء علیہم السلام کا مقصد یہ نہیں ہوتا بلکہ ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ بندگان خدا کو احکام رب العزت میں مقام اطاعت اور فرمان برداری کے وسیلے کا رسوخ پیدا ہو، تا کہ ان کے تہذیب الاخلاق اور اصلاح اعمال کا باعث ہو، اسے موعظت حسنہ کہتے ہیں۔

ایک تیسرا طریقہ: شاہ اسمٰعیل اپنی کتاب منصب امامت میں دعوت کے ایک تیسرے طریقے کے متعلق بھی لکھتے ہیں اور اس طریقے کا انحصار دراصل اپنی تحریک کی تین منزلوں کا اشارہ ہے، اب یہ تیسرا طریقہ دعوت بھی دراصل اپنی اسی تحریک کی نئی منزل کا اعلان ہے۔

شاہ اسمٰعیل شہید اور سید احمد نے اپنی تحریکوں میں تین موڑ مقرر کیے ہیں۔ کبھی کبھی یہ لوگ مقام دعوت کے ایک تیسرے طریقے کو بھی استعمال میں لاتے ہیں۔ یہ آخری موڑ تھا جس کا تقاضا جہاد تھا، اور اسی جہاد کو احسن طریقے سے منظّم کرنے کے لیے امامت کا مسئلہ اُٹھا۔ سید احمد کو امام تسلیم کیا گیا، چنانچہ تحریک کے اس موڑ کی اہمیت سب سے زیادہ تسلیم کی جاتی ہے، اس لیے کہ اسی امامت اور اسی مسلک کے تحت ایک نئے نظام حکومت کی ترویج کا اعلان کیا گیا تھا اور یہی نظام حکومت بعد میں اس تحریک کی ناکامی کا بھی ایک حد تک سبب بنا۔ اس لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ ان حالات کو سامنے رکھا جائے جن کے تحت سید احمد کی امامت کا اعلان کیا گیا۔

سید احمد اور ان کے رفقاء کی یہ تمام کوششیں، تگ و دو، مسافرت کی صعوبتیں طول طویل راستوں کی مشکلات، حتیٰ کہ اپنے وطن اجداد کو ترک کرنے کی غرض و غایت اعلان کلمۃ الحق کا اجراء تھا۔ ہندوستان کو غیر مسلموں کی غلامی سے نجات دلانا تھا۔ صوبہ سرحد اور پنجاب کو سکھوں کے ناپاک قدموں سے پاک کرانا تھا اور ان کے مقاصد کے لیے جذبۂ جہاد اور ولولۂ خدمتِ اسلام نے انھیں ہندوستان کے دور دراز علاقوں سے سرحد کے پہاڑوں تک پہنچایا، انھیں ابتداً اپنے نیک مقصد میں کامیابی بھی ہوئی۔ علاقے کے باشندے جوق در جوق ان کے ہاتھ پر بیعت کرنے لگے، ہر شخص ان کی تبلیغ سے متاثر ہو کر میدانِ جہاد میں کود جانے کا متمنی نظر آیا، ان کے ایک اشارے پر سب مر مٹنے کو ہمہ تن تیار دکھائی دیئے۔ بلاشبہ وقتاً فوقتاً ایسے علماء دین پیدا ہوتے رہے جنھوں نے ہر چیز سے بے نیاز

ہوکر صحیح معنوں میں اسلامی تعلیمات کی تبلیغ کی۔لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ کثرت ان ہی لوگوں کی تھی جن کی علمیت محدود تھی، جو قرآن وسنت کو پوری طرح سمجھ بھی نہیں سکتے تھے لیکن اپنے مخصوص ماحول میں انھیں عزت، وقعت اور اقتدار حاصل ہوگیا تھا۔ایسی قوم سے راہ ورسم پیدا کرنا، اسے اپنے صدیوں کے راستے سے ہٹا کر کسی نئی راہ پر چلانے اور خصوصاً ان اُمور کو ترک کرنے پر آمادہ کرنے کے لیے کہ جنھیں وہ حکم خدا اور رسولؐ یقین کر چکے ہوں، بڑے ہی صبر وتحمل، فہم وفراست، سوچ بچار اور تدبیر وحکمت کی ضرورت تھی۔

سید صاحب اپنے پاک جذبات سے اس قوم میں آکر مقیم ہوئے تو ان کے رسم ورواج یا ان کی عادات سے قطعاً واقف نہ تھے۔حالات کو دیکھ کر وہ یہی فیصلہ کر سکے کہ مروجہ رسومات شریعت اسلامیہ کے خلاف تھیں اسی وجہ سے پہلے ان کی اصلاح ہونی چاہیے اور اس کے لیے اقدام شروع کر دیا۔سید صاحب کو سرزمین سرحد پر بہت سے مخلص ساتھی مل گئے ان ہی کی وجہ سے قوت وطاقت بھی میسر آئی، انھوں نے اس طاقت کو استعمال کرتے ہوئے احکام شرعی کا نفاذ کر دیا۔

سید صاحب کے نزدیک مسلمانوں کی تمام مصیبتوں کی جڑ یہ تھی کہ وہ صراط مستقیم سے منحرف ہو چکے تھے ان میں خدا کے دین کی سربلندی کے لیے کوئی تڑپ اور کوئی بے تابی باقی نہ رہی تھی۔وہ روح جہاد سے خالی ہو چکے تھے یہی وجہ ہے کہ سید صاحب نے سیاسی عظمت وبرتری کو اپنا نصب العین نہ بنایا، صرف احیائے اسلام پر اپنی دعوت کی بنیاد رکھی۔وہ مدعیان اسلام وسچے مسلمان بنانا چاہتے تھے اور ان میں خدمت دین اور تکمیل مقاصد اسلام کی سچی لو لگانے کے خواہاں تھے۔

سیاسی زوال نے صرف اخلاقی اقدار ہی کو مجروح نہیں کیا تھا بلکہ اس نے دینی عقائد کو بھی بری طرح مسخ کیا تھا۔غیر اللہ کی عبادت معمول بن گیا تھا اور پیروں کے عرسوں کا سلسلہ عام تھا، میلاد اور گیارہویں شریف اور اس قسم کی مجالس وتقریبات کے زور وشور کا بھی یہی زمانہ تھا۔ان رسوم اور تقریبات کے متعلق ایک گروہ جواز کا فتویٰ دیتا تھا، ان کو مقدس اور جائز بلکہ ضروری تصور کرتا تھا۔اس زمانے میں ان ہی رسوم پر اکتفا نہ تھا بلکہ بے شمار دوسری رسومات بھی اسلام کا جزو قرار پائیں، حالانکہ اسلام اور اس کی تعلیمات میں ان کا کہیں بھی ذکر نہ تھا لیکن یہ تمام کی تمام ہندوؤں سے میل جول کے باعث مسلمانوں کی زندگی میں داخل ہوگئیں۔بہرحال توہم پرستی، جن بھوت اور تعویذ گنڈوں پر اعتقاد عام تھا اور جیسے جیسے قوم کی خود اعتمادی غائب ہوتی جارہی تھی، ویسے ہی قبر پرستی اور اولیاء سے استعداد کا عقیدہ تقویت پکڑتا جارہا تھا، کہیں امام کے آنے کا چرچہ ہوتا اور کہیں مہدی کا انتظار ہوتا۔

بہرحال اس قسم کے عقیدے مذہبی طور پر جائز تھے یا نہیں لیکن قومی کردار اور جدوجہد کی صلاحیتوں اور عملی قوتوں پر ان کا اثر بہت مہلک ثابت ہورہا تھا۔یہ اخلاقی اور دینی حالت پچھلی ایک صدی سے اس برصغیر کا مقدر ہو چکی تھی، اس میں آئے دن اضافہ ہورہا تھا اور کمی کی کوئی سبیل نظر نہیں آتی تھی۔حضرت شاہ ولی اللہ، اس اخلاقی پستی اور دینی انحطاط کی حالت کے خلاف مصروف جہاد تھے۔سید احمد نے جب دہلی کا رُخ کیا تو اخلاقی اور دینی انحطاط کے ساتھ ساتھ سیاسی تنزلی بھی اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھی اور یہی وہ زمانہ تھا جب ایسٹ انڈیا کمپنی شمالی ہند کی طرف اپنے قدم بڑھا رہی تھی۔

اٹھارہویں صدی کے حالات وعوامل کا اثر یہ ہوا کہ اس روایتی معاشرے کے فرد کے کردار میں بحران پیدا ہوگیا۔ کردار کے اس بحران کی وجہ سے فرد کی زندگی سے وہ توازن جاتا رہا جو خیر وشر کے درمیان امتیاز پیدا کرتا ہے اور مثبت اصول زندگی اور اخلاقی اقدار ستون کا کام کرتے ہیں، جن کے تحفظ کے لیے فرد جدوجہد کرتا ہے، منفی قوتوں کا مقابلہ کرتا ہے اور کردار کی بلندی کو معاشرے میں قائم کر کے اسے زندگی میں اہم مقام دیتا ہے، اس کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ حکمران طبقے کے اندر قوت عمل مفلوج ہوگئی۔ عیش پرستی، گروہ بندی خود غرضی اور تنگ نظری نے اس کی جگہ لے لی۔ ملک وملت کے اہم اور بنیادی مسائل نظر انداز ہونے لگے، سیاسی فہم اور بصیرت عنقا ہوگئے۔ فرد کو اب کسی ایک چیز پر یقین نہیں آرہا تھا، وہ ملت جو سپاہی پیدا کرتی تھی اب بانکے پیدا کرنے لگی، پیشہ ور سپہ سالار بھی میدانِ جنگ کی طرف پالکیوں میں جانے لگے۔ مذہب کی جگہ اوہام پرستی نے لے لی۔ ملّی اور مذہبی وفاداریاں خود غرضی کا شکار ہونے لگیں۔ صرف ایک سلطنت کو ہی زوال نہیں آرہا تھا بلکہ ایک ملّت اپنے بلند اخلاقی مقام سے گر کر ذلت کے گڑھے میں چلی گئی اور اس نے وہ سب کچھ خاک میں ملا دیا تھا جو اس کی عظمت وقوت کا باعث تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سارا معاشرہ اندھا، گونگا اور بہرہ ہوگیا ہے، نہ دیکھتا ہے نہ سنتا ہے اور سچ بولتا ہے۔ اگر اس معاشرے کو مجموعی حیثیت سے دیکھا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ احساسِ اقدار ختم ہوگیا ہے۔ فرد کے طرزِ عمل میں فرض شناسی کے بجائے خود غرضی آگئی ہے، اوہام پرستی اور ضعیف الاعتقادی نے حقیقی مذہب کی جگہ لے لی ہے۔ عمل کی جگہ جس پر ہر معاشرے کی ترقی کا دارومدار ہے، خواب، تعویذ گنڈوں اور جھاڑ پھونک نے لے لی ہے، بے یقینی کو فرد کے مزاج کا حصہ بنا دیا ہے، آنے والے کل پر یقین نہیں ہے اس لیے وہ اپنے لیے سب کچھ آج ہی کر لینا چاہتا ہے۔ سارا معاشرہ عدم توازن کی بیماری میں مبتلا ہے جن گروہوں کو معاشرے کی فلاح و بہبود کا محافظ ہونا چاہیے تھا وہ اس کا خون چوسنے لگے۔ جو کچھ وہ صرف کرتے اس کے معاوضے میں کوئی خدمت انجام دینے کے بجائے انھوں نے اپنی حالت اس قدر تباہ کر لی کہ غارت گرانہ استحصال یا محض بیکاری کو اپنا وتیرہ بنالیا۔ اس بیماری میں جو بھی طبقہ مبتلا تھا وہ حکمران طبقہ تھا جس میں درباری امراء، وزراء، عمائدین اور اعمال شامل تھے، جن کے پاس طاقت بھی تھی اور دولت بھی۔ اس لیے وہ جو کچھ کرتے تھے اس کا اثر معاشرے پر، عوام پر پڑنا لازمی تھا۔ سارا معاشرہ ان سے متاثر ہو رہا تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ سارا معاشرہ ویسا ہی ہوگیا جیسے وہ خود تھے۔ اس پوری صدی میں سترہویں صدی کا بوڑھا نظام خیال دم توڑتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس میں ہر سطح پر وقت کے تقاضوں کے مطابق تبدیلی کی ضرورت تھی۔

اٹھارہویں صدی میں یہ محسوس ہوتا ہے کہ فکر وذہن ایک جگہ ٹھہر گئے ہیں۔ سارا معاشرہ ماضی کے ضابطوں، اصولوں اور قوانین کو بغیر کسی تبدیلی کے قبول کیے ہوئے ہے۔ رسم پرستی اس کا مزاج ہے۔ وہ مستقبل کے بجائے ماضی پر تکیہ کیے ہوئے ہے۔ اور یہ ماضی اس کے حال کو متاثر نہیں کرتا۔ معاشرے کی روح مُردہ ہوگئی ہے، اور باطن میں گھپ اندھیرا ہے۔ مسلمان اس دور میں معیارِ شرافت وتہذیب کے نمائندے تھے، مسلمانوں میں معیارِ شرافت یہ تھا کہ وہ نوکر پیشہ ہو، دربارِ سرکار میں پہنچ رکھتا ہو یا کسی امیر کا مصاحب ہو۔

اس تفصیل سے اٹھارہویں صدی کے مزاج، اس کے طرزِ معاشرت، اس کے اخلاق اور اس کے کردار کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ بہادری، شجاعت اور عسکریت کے عناصر ضائع ہو چکے ہیں۔ عدم تحفظ کے احساس نے معاشرے کو بے عمل و مفلوج کر دیا ہے۔ اسی لیے یہ معاشرہ وہ راستہ اختیار کرتا ہے جس پر چل کر اس پُر آشوب زمانے کو وقتی طور پر بھلا سکے۔

(۵)

اٹھارہویں صدی اور دینی ادب: آہستہ آہستہ اردو نثر کے اسالیب متعین اور واضح ہونے لگے قرآن مجید کے تراجم، تفاسیر، احادیث، کتب آسمانی، سیرت رسولؐ کے مختلف واقعات، دینی مسئلے اور مسائل اخلاق کی تہذیب اور تفسیر کے لیے جو کتابیں لکھی گئیں وہ تعداد میں سب سے زیادہ ہیں۔ بعض کتابیں فارسی سے ترجمہ یا ان سے ماخوذ ہیں، لیکن اسلوب ان کا بھی سادہ اور عام فہم ہے دوسرے درجے پر وہ کتابیں ہیں جو تصوف و معرفت کے مختلف مضامین و موضوعات سے متعلق ہیں۔ بعض مخطوطات غیر قلمی نسخے ہیں جو شائع نہ ہو سکے۔ ذیل میں مخطوطات اور مطبوعات کی علاحدہ علاحدہ فہرست دی جا رہی ہے۔

نمبر	نام کتاب	مصنف یا مؤلف	سن تصنیف ہجری	عیسوی سن
۱	تفسیرِ تنزیل	نام ندارد	۱۱۴۰ھ	۱۷۲۷ء
۲	خزانۃ الفوائد	عبدالمجید	۱۲۰۲ھ	۱۷۸۷ء
۳	دین دیپک منظوم	محمد علی شاہ الفت	۱۱۹۴ھ	۱۷۸۰ء
۴	فقہ النبین	دکھنی، یقین	۱۱۸۲ھ	۱۷۶۸ء
۵	مسائل ستی منظوم	محمد علی	۱۱۸۳ھ	۱۷۶۹ء
۶	یک صدی مسائل	نام ندارد	۱۲۱۵ھ	۱۸۰۰ء
۷	منتخب الاحکام (منثور و منظوم)	محمد صغیر پیر	۱۱۹۱ھ	۱۷۷۷ء
۸	خزانہ حسنات (ترجمہ مفتاح الصلوٰۃ)	برہانپوری شیخ فتح محمد	۱۱۸۲ھ	۱۷۶۸ء
۹	تہید التقریر (مہدزیات)	مہدی جیون خان	۱۱۸۷ھ	۱۷۷۳ء
۱۰	خزانہ معرفت منظوم	حق نما محمد شاہ	۱۱۸۱ھ	۱۷۶۷ء
۱۱	نزہت العاشقین (تصوف)	ذوقی	۱۱۱۱ھ	۱۶۹۹ء
۱۲	(الف) رسالہ خوش و معما ارشاد۔ نظم (مجموعہ رسائل)	ارشاد خوش	۱۲۰۵ھ	۱۷۹۰ء
	(ب) رسالہ کسب کردن (اسلامیات)	محمود شیخ	ایضاً	ایضاً
	(ج) علم سفینہ فارسی تصوف	ایضاً	ایضاً	ایضاً
	(د) مختصر وجودات (منظوم)	ایضاً	ایضاً	ایضاً

	(ہ) کلام صدرالدین (نظم)	صدرالدین	ایضاً	ایضاً
	(و) سراج الوجود فارسی (تصوف)	شکرگنج فریدالدین شیخ چشتی	سن ندارد	سن ندارد
۱۳	جواہرالاسرار	جیوگام شاہ علی	۱۱۸۷ھ	۱۷۷۳ء
۱۴	قصیدہ بحیرالاسرار فارسی عین القضات قاضی	حافظ محمد	۱۱۸۷ھ	۱۷۷۳ء
	نجات نامہ	ایاض	۱۱۱۲ھ	۱۷۰۰ء
	نصیحت نامہ	اسمٰعیل محمد	سن ندارد	سن ندارد
۱۵	نورنامہ	شاہ عنایت	۱۱۶۲ھ	۱۷۴۸ء
	شہادت نامہ	مسلم فرزندان	سن ندارد	سن ندارد
	نورالہدایہ سکرات نامہ	محمد حیات	سن ندارد	سن ندارد
	حکایات تمثیلی	نام ندارد	۱۱۱۳ھ	۱۷۰۱ء
	مولود نامہ	محمد مختار	سن ندارد	سن ندارد
	محی الدین نامہ	قادری	سن ندارد	سن ندارد
۱۶	وفات نامہ رسول خدا	محمد مختار مختار	سن ندارد	سن ندارد
	کلام مختار	محمد مختار	سن ندارد	سن ندارد
	وصیت نامہ	حمزہ شیخ	سن ندارد	سن ندارد
	نورنامہ	حسن	سن ندارد	سن ندارد
۱۷	زادالعوامل (فقہ منظوم)	ولی محمد سید	۱۱۳۲ھ	۱۷۱۹ء
	قصہ حضرت عیسیٰ	غلام محمد	سن ندارد	سن ندارد
	حضرت مریم	میراں	۱۱۲۳ھ	۱۷۱۱ء
	رسالہ حسین لاابالی	حسین لاابالی	سن ندارد	سن ندارد
۱۸	یوسف زلیخا عشق نامہ	حسین فداالدین	۱۲۱۲ھ	۱۷۹۷ء
۱۹	جنگ نامہ (امیر حمزہ)	حسین قربان میر ناصر محمود	۱۲۱۲ھ	۱۷۹۷ء
۲۰	رسالہ فقہ	اسمٰعیل	۱۱۷۶ھ	سن ندارد
۲۱	وفات نامہ (رسول مقبول ﷺ)	عبدالرسول	۱۱۷۸ھ	۱۷۶۲ء
	وفات نامہ (حضرت بی بی فاطمہؓ)	فتح الدین سید	سن ندارد	سن ندارد

	وفات نامہ (رسول مقبول ﷺ)	ولی	۱۱۸۸ھ	۱۷۴۲ء
	غم نامہ	احمد	سن ندارد	سن ندارد
۲۲	خالق باری	ضیاءالدین حسرو سید محمد یاسین	۱۱۸۷ھ	۱۷۷۳ء
	دلائل خیرات (مع مخطوطات شاہ ولی اللہ)	مکی نخلی شیخ احمد	۱۲۱۴ھ	۱۷۹۹ء
	منتخب الاحکام	صغیری پیر محمد	۱۱۹۱ھ	۱۷۷۷ء
	مراۃ الاسرار	صدرالدین شاہ محمد	۱۱۸۴ھ	۱۸۶۷ء

مطبوعات

نمبر	نام کتاب	مصنف یا مؤلف	سن تصنیف ہجری	عیسوی سن
۱	تفسیر چراغ ابدی	سید عزیز اللہ ہمرنگ اورنگ آبادی	۱۲۲۰ھ	۱۸۰۵ء
۲	تفسیر ہفت پارہ	سید بابا قادری	۱۱۸۴ھ	۱۷۷۰ء
۳	قصص الانبیاء منظوم	مصنف غوثی	۱۲۰۳ھ	۱۷۷۷ء
۴	خزانۃ الفوائد	عبدالمجد	۱۲۰۳ھ	۱۷۸۸ء
۵	جوار اسرار اللہ	شاہ علی محمد جیو گام	۱۱۸۷ھ	۱۷۷۳ء
۶	احوال مسیت	قاضی محمد شمس الدین	۱۲۰۰ھ	۱۷۸۵ء
۷	رسائل تصوف	ہاشمی مرحوم	۱۱۶۰ھ	۱۷۴۷ء
۸	بوستان خیال	سید شاہ سراج اورنگ آبادی	۱۲۱۲ھ	۱۷۹۷ء
۹	مظہر الحجائب	حکیم فخر الدین احمد	۱۱۶۳ھ	۱۷۴۹ء
۱۰	بدر انور	صفی	۱۱۶۰ھ	۱۷۴۷ء
۱۱	دلائل الخیرات	شاہ ولی اللہ	۱۱۸۳ھ	۱۷۶۹ء
۱۲	وجود العاشقین	بندہ نواز گیسو دراز	۱۱۰۴ھ	۱۶۹۳ء
۱۳	عقائد دینیہ	ضیاءالدین	۱۲۰۵ھ	۱۷۹۰ء
۱۴	علوم شریعت و طریقت	میر محمد چشتی	۱۱۰۳ھ	۱۶۹۱ء
۱۵	تحفۃ المجالس	راج کرن	۱۲۰۱ھ	۱۷۸۶ء
۱۶	فیوض العرف	ابوتراب	۱۱۷۴ھ	۱۷۶۰ء

۱۷	کتاب الدعا	محمد ین محمد حرزی (حاجی)	۱۱۸۲ھ	۱۷۶۲ء
۱۸	رسالہ میت	ابوبکر لاہوری	۱۱۸۲ھ	۱۷۶۸ء
۱۹	رسالہ قرات	ابن ابراہیم مصطفیٰ القادری	۱۱۱۰ھ	۱۶۹۸ء
۲۰	کتاب تصوف	عبداللہ انصاری	۱۱۶۳ھ	۱۷۴۹ء
۲۱	طرائق رفاعیہ	غلام رفاعی محمد رفیع	۱۱۶۰ھ	۱۷۴۷ء
۲۲	طریق بیعت	غلام رفاعی محمد رفیع	۱۱۶۰ھ	۱۷۴۷ء
۲۳	طریق حیدری	غلام رفاعی محمد رفیع	۱۱۶۰ھ	۱۷۴۷ء
۲۴	روح الارواح (تفسیر قل ھواللہ)	محمد حیات	۱۱۳۱ھ	۱۷۱۸ء
۲۵	روضۃ الشہداء	حسین الکاشی	۱۱۳۱ھ	۱۸۱۵ء
۲۶	رمقات محمدی	شیخ الزمان عرض محمد	۱۲۰۷ھ	۱۷۹۲ء
۲۷	رسالہ فن	سید ابوالعلیٰ احراری الحسینی	۱۲۰۷ھ	۱۷۹۲ء
۲۸	من موہن	مولوی محمد باقر آگاہ	۱۱۸۶ھ	۱۷۷۲ء
۲۹	رسالہ منظوم	محی الدین قادری مرحوم	۱۱۷۶ھ	۱۷۶۲ء

حواشی:

۱ تفصیلی مطالعے کے لیے درج ذیل کتب ملاحظہ کیجیے:
ولیم ایل لینگر، انسائیکلو پیڈیا تاریخ عالم، مترجم غلام رسول مہر، جلد سوم۔
جادوناتھ سرکار: تاریخ عالمگیر ثانی بحوالہ دلی سلطنت مغلیہ، جلد دوم، کلکتہ۔
ہاشمی فرید آبادی: تاریخ مسلمان پاک و بھارت، حصہ اول، کراچی، جلد دوم، ۱۹۵۳ء۔
محمد آرسی اور دیگر مصنفین: ہندوستان کی اعلیٰ سطحی تاریخ۔
میڈوز ٹیلر: ٹھگ اور امیر علی ٹھگ کے تاریخی کارنامے: فکشن ہاؤس، لندن۔
طفیل احمد سید: مسلمانوں کا روشن مستقبل، دہلی۔ ۱۹۴۵ء۔
تھامس ولیم بیل: مفتاح التواریخ، مطبوعہ نول کشور، کانپور۔
عبدالسلام: تاریخ ہند بعہد برطانیہ، مطبوعہ حیدر آباد دکن، بحوالہ تنویر احمد علوی، لاہور، ۱۹۶۳ء۔
امسپیئر، مغلوں کی شام پریسول، کیمبرج، ۱۹۵۱ء۔
احمد حبیب، جامع تاریخ ہند، نئی دہلی، ترقی اردو بیورو، ۱۹۸۴ء۔
ڈی ڈی کوسمبی، قدیم ہندوستان کی ثقافت وتہذیب تاریخی پس منظر میں، نئی دہلی، ترقی اردو بیورو۔
غوری وقار حسین، برصغیر پاک و ہند کی قدیم تاریخ، کراچی، ۲۰۰۴۔
ساقی محمد المعروف مستعد خان، تاثر عالمگیری، کلکتہ ۱۹۷۰ء۔
جنید محمد خان، عالم عیسائیت تاریخ کے آئینے میں، القلم لاہور۔

ڈیوی رابرٹ ای، فریڈم، دی میکیلین کمپنی لندن، ۱۹۷۰ء۔
کرینسٹن ایم، ہیومن رائٹس ٹو ڈے، لندن، ۱۹۶۴ء۔
لیکنن جی ایم، مترجم اسٹرابو نیز جغرافیہ کا، اسٹرابو، دی کونسل آف جغرافی، نیویارک، ۔
ہیرلڈ لیم، صلاح الدین ایوبی، مترجم محمد یوسف عباسی، بک کارنر شوروم، جہلم۔
الاربعی، محمد الحسین، الغزو الفکری، دار العلوم، دمشق، ۱۹۹۹ء۔
گستاؤلی بان، تمدن عرب، مترجم محمد جمیل، ادارۂ فکر اسلامی، لاہور۔
اسد، محمد، دی روڈ ٹو مکہ، اسلام لینڈ، آسٹریلیا۔
فرینکلن جان، دی ایسٹ انڈیا ان ساؤتھ ایشیا، ترجمہ، از باحث، دی لائن، لندن، ۔
عالم خورشید محمد، واقعات جنگ آزادی اور مسلمان، العلم اکیڈمی، جہلم۔
سرسید احمد خان، عبداللہ ڈاکٹر سید، سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۰۸ء۔
الصدیق الحسینی محمد تنزیل، برصغیر پاک و ہند کے تاریخی حقائق، دار الفکر، کراچی، ۲۰۰۵۔
اکرام، شیخ محمد، ''موج کوثر''، ادارۂ ثقافت اسلامیہ لاہور، ۱۹۸۸ء۔
مہر، غلام رسول، ۱۸۵۷ء، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۷۱ء۔
انڈین انٹیلی جنس ریکارڈز، جلد اول۔

۲۔ خلیق احمد نظامی (مرتبہ) تذکرہ شاکر خان: بحوالہ شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات، مطبوعہ علی گڑھ، ص ۱۶۲۔
۳۔ ایضاً۔
۴۔ مناظر احسن گیلانی، تذکرہ شاہ ولی اللہ، مطبوعہ: انٹرنیشنل پریس کراچی، طبع سوم، ص ۲۴۹۔
۵۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، دانش گاہ پنجاب، لاہور، ۱۹۷۳ء، جلد ۱۲۔ ص ۹۳۵۔
۶۔ سرسید احمد خان، تذکرہ اہل دہلی، انجمن ترقی اردو کراچی، ۱۹۵۵ء، ص ۷۵۔
۷۔ عبداللہ ملک، بنگالی مسلمانوں کی صد سالہ جدوجہد ۱۷۵۷ء تا ۱۸۵۷، مجلس ترقی ادب لاہور، ص ۲۰۔
۸۔ ایضاً، ص ۳۵۔
۹۔ ایضاً، ص ۲۳۔
۱۰۔ ایضاً، ص ۳۳۔

فہرستِ اسنادِ محوّلہ:

۱۔ ''اردو دائرہ معارف اسلامیہ''، جلد ۱۲، ۱۹۷۳ء، دانش گاہ پنجاب، لاہور۔
۲۔ خان، احمد، سرسید: ۱۹۵۵ء، ''تذکرہ اہل دہلی''، انجمن ترقی اردو، کراچی۔
۳۔ گیلانی، مناظر احسن: س ن، ''تذکرہ شاہ ولی اللہ''، طبع سوم، انٹرنیشنل پریس کراچی۔
۴۔ ملک، عبداللہ: س ن، ''بنگالی مسلمانوں کی صد سالہ جدوجہد ۱۷۵۷ء تا ۱۸۵۷''، مجلس ترقی ادب، لاہور۔
۵۔ نظامی، خلیق: ۱۹۵۲، (مرتبہ)، ''شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات''، مطبوعہ علی گڑھ۔